

کچھ بھی طہی نہیں کیا۔ ہم تو اپنی آگ میں اپنے اپنے شہادت میں، اپنی اپنی نیک نتیجی میں یوں جلتے رہتے ہیے فاسفورس سندھی آگ میں رونگ رہتا ہے۔ ہم تینوں نے بڑی ضعیافتی بڑی محبت سے، بڑے خلوص سے ایک دوسرے کی ذرگی تباہ کر دی۔

نیکیاں نیکیں کو مجرور کرنے رہیں۔

محبت نے محبت کا لگا گھونٹ دیا۔

شرافت نے بڑی شرافت سے جان لسل۔

ہم تینوں کو ایک دوسرے کے دل کا اس قدر خیال تھا کہ بالآخر اسی خیال نے تینوں دل کھول میں ڈال کر کشتہ بناؤ لے۔

علیہ میری زندگی میں اس طرح آئی جیسے سادوں میں بارش برستی ہے اور جس بارش سے پہنچا ٹوٹ جلتے ہیں۔ چھتیں بیٹھ جاتی ہیں اور مرڑوں پر متعفن پانی کھدا ہو جاتا ہے۔

زمبایسری زندگی میں وہ گلاں بھر پانی بن کر کی جو ریگت ان میں تھی ہوئی دوپر کے دلت امباہی سے اور جس پر کسی دشمن کی سلیکن پھرہ میں کھڑی ہوتی ہے۔ علیہ میرے حبم کا، میری غلطیوں کا، میری عادتوں کا مجرعہ تھی اور زمباہ سائیکلوانیسٹ تھی جس کے سامنے مجھے پنے وجود سے اپنی غلطیوں سے اپنی عادتوں سے اپنی انسے چھپ کارا حاصل کرنے کے الکانات نظر آتے تھے۔

کبھی کبھی لوٹ کر دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہر شادی کو غاباً روزمرہ کی دہ زندگی کھما جاتی ہے جو قطرہ قطرہ نہ گھولتی ہے جس طرح زیادہ میٹھے پھل میں خود بخود سندھی پیدا ہو جاتی ہے شادی کے کچے ہوئے آڑو میں بھی اپنے اپت وہ کیرٹے پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اڑو فیضی خواہ چھڑ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا پڑتا۔

بھر کیف زمباک کے آنے کے بعد جو کچھ بھی ہوا — اور جو کچھ بھی نہ ہوا — اس طرح ہماری خوشبوں کی بھلی بھجی اور میں سوچ فیوز ہوا، اس کا تعلق اسی ایسے سب سے جسے روزمرہ کی زبان میں شادی کہتے ہیں۔

مرد کی ذات ایک سمندر سے مشابہ ہے۔ اس میں ہمیشہ پرانے پانی بھی رستے تھے ہیں اور نئے دریا بھی آکے گئے رہتے ہیں۔ سمندر سے پرانی دفا اور نیا پیار علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ان دونوں کے لئے کٹھ مرے گا۔

لیکن عورت اسی جھیل کی ماندہ ہے جس کا ہر چشمہ اس کے اندر ہی سے نکلتا ہے۔ اب یہ میں جب جھیل کی زندگی اور ہے اور سمندر اور طرح سے رہتا ہے۔ ان دونوں کا ہمیشہ یہ بھار حصنا کقدر مشکل ہے۔ چھلی اور باہیل کے سینگ کی طرح اسی میں ہمیشہ نظریے کے اختلاف کی گناہش ہے۔ عطیہ کون تھی؟

زبماں کون ہے؟

کیا یہ دونوں ایک دوسرا سے مختلف ہیں؟ یا دونوں ایک ہی سپاٹی کے دو

روپ، میں؟

عطیہ سے زبماں اور زبماں سے کسی اور عورت تک کتنا مصلحت ہے؟ پھر یہ بھی سوال ہے ایک عورت سے دوسرا عورت تک میرا جو دو کس بات کی نشاندہی کرتا ہے یہ کس باطل نفس کی تکرار مجھے ایک وجود سے دوسرا وجود تک یہی گھمائے پھرتی ہے جیسے بھروسہ آندھی میں گندم کے دلنے کا ایک آدارہ نیجے۔

جب پہلی بار میں نے زبماں کا ذکر عطیہ سے کیا تو وہ تمیض اٹھائے پینگ پر لٹی منے کو دو دو پھا رہی تھی منے کے بال اور ماتھے پر پسینے کے قظر سے تھے اور وہ اپنی باعثیں ٹانگ ٹانگ عطیہ کے پیٹ پر رکھئے ہوتے تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرا کی ذات میں پیروست تھے۔ لکڑی کے تختے میں لکڑی کی لکڑہ لگڑی ہوتی تھی۔ میں نے اس فوجوان پینگ زادی کے پاس بیٹھ کر منتظر ہجے میں کہا: ”کل میرے لکینک پر ایک لڑکی آئی تھی۔ اسے افریقہ سے آئے ایک سہفتہ ہوا ہے اور بے چاری بیمار بھی پڑ گئی۔“

”افریقہ سے کبیوں آئی ہے۔“ عطیہ نے دو پیٹ سے منے کا سر پوچھ کر پوچھا۔

”ڈاکٹری پڑھنے۔“

میں عطیہ سے عموماً اپنے مرلیفوں کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن یہ ذکر مختلف تھا۔ میری شرانت عطیہ کو کاشن دے رہی تھی۔ جگار ہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میں وہ بوجھجی سرسری طور پر سر سے آتارنا چاہتا تھا جو زمبا کو دیکھ کر مجھ پر پڑ گیا تھا۔ لیکن یہ بوجھا تینی آسانی سے اڑا تھوڑی کرتے ہیں۔

اچانک سوتے میں گھٹے میں بل پڑ جائے اور رہ رہ کر... بھرٹھر کرٹیں ہی اٹھے  
”افریقیں کہاں رہنے ہیں اس کے ان باپ .....“

”کینیا میں — اس کا باپ کپڑے کا بیوی پار کرتا ہے:  
کیا بیماری ہے ..... اے .....“

”گردوں میں درد تھا۔ اب ٹھیک ہے۔“

عطیہ نے بچکے کے ماتھے پر ہونٹ رکھ کر آہستہ سے کہا: ”بے چاری پر دیکھ ہے۔

آپ اس کا خیال رکھنے لگا:

اس پروانہ راہداری نے گویا غیر قانونی چیزوں کی درآمدی کا باب گھول دیا۔ عطیہ اس گھوڑے کی اندھی جو ایک ہی کھونٹے سے بندھا چکر پر چکر لگائے تھک جاتا ہے جاتا ہے لیکن اس کی منزل اس چکر سے باہر نہیں نکلتی — اور زمبا جنگلی چیل کی طرح تھی ہر قائد سے سے آزاد — یا شاید یہ بھی میرا رہم تھا۔

ثردوع شروع میں زمبا کے متعلق پچھلی رات کو سوچتا مجھے اخلاقی چوری سی لگی لیکن اس مریضن کی طرح تھا جس کی آنکھ رات کے آخری کنارے جا گئی ہے اور پہردن چڑھنے میں نہیں آتا۔ مجھ میں اور زمبا میں کوئی رابطہ نہ تھا حتیٰ کہ نگاہ کی پیاسا کر سانی تک موجود نہ تھی۔ پھر جب وہ قریب ہوتی تو میری انگلیاں اس کے جسم کو نجوس کر لیتیں میں غیر شوروی طور پر اس کے جسم سے آشنا ہو چکا تھا۔ غرائز کرنی بلی سا گرم جسم اُنکھے چین کے درخت کی تازہ

کو پنپ کی طرح مڑ جانے والا رس دار — کرنے کے پھولوں سے لدے ہوئے پھارڈوں کی طرح خوبصورت سے لدا ہوا۔ محبت خیال کے علاوہ اور ہے جی کیا؟

میں نے اس کے جسم کو چھو کر نہیں دیکھا تھا لیکن آنکھیں بند کرنے پر اس کا ایک ایک خم، اس کا ایک ایک اتار چڑھا دا، اس کی حدت، اس کی زیست سب کو میں محوس کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ میں کلینک میں، لگھ پر امریفوں کے گھروں میں، فلم دیکھتے ہوئے، دکانوں پر خرید و فروخت کرتے ہوئے زمبا کے مقلق سوچنے لگا۔ لیکن یہ سوچ ایک باب کی سوچ تھی... لیے باب کی جس کی بیٹی سسرال جا چکی ہو اور جو سمجھنا پائے کہ بیٹی کا اصلی گھر اس کا گھر نہیں ہے!

زمبا کے گھروں میں معمولی سادہ دخال چند دن کے علاج کے بعد یہ شکایت جاتی رہی لیکن وہ کلینک پر آتی رہی۔ میں نے نسخے کی جگہ تاکہیں لکھنی شروع کر دیں۔ تا انکوں کے بعد وہ مانز کی باری آگئی۔ اس کے بعد کئی دن پر، یہ زیست اتارتا۔ وہ میرے مشورے بڑے غور سے سنتی۔ پھر اچانک ہم دلوں ایک ہی وقت میں ایکدوسرے کی طرف دیکھ دیتے۔ یہ بہ نہ نظر ہم دلوں کو ایک درک شاک کی طرح لگتی اور ہم خاموش ہو جلتے۔ میں نے کبھی اس سے مراسم بڑھانے کی کوشش نہ کی۔

وہ کسی بھی مجھ سے بے تکلف ہونے پر کامادہ نظر نہ آئی۔

پھر بھی ہم دلوں کے درمیان ایک آن کما رابطہ بڑھتا رہا۔ فرمہ ہو رہا تھا۔ بغیر کسی مانع کے۔ بغیر کسی دلaman کے۔

انسان درخت کی اندکیوں ہے کہ دن پر دن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جو کل تھا سوچ نہیں ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا۔ اس تبدیلی ہوتے ہیوں ہے اس سیاہ صفت سیاہ چیز سے دفاکی تو قع کتنی غلط چیز ہے؟ باطل نقش سے ابھی محبت کی تو قع ایسی ہے جیسے تم کمال دینے کے بعد عورت سنبھے کی قدر۔

اُنہاں نام طور پر اس عکس سے، اس تصوری سے، اس انتہی سے محبت کرتا ہے جو اسکا ذہن خلائق کرتا ہے۔ اس تصویر کا اس کے محبوب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لئے محبت کئے جانا اتنا آسان فعل بھی ہے اور اس قدر مشکل ہر بھی۔

عطیہ جس داکٹر سے محبت کر رہی تھی وہ اسکی ذات سے بھوٹا ہوا چشم خدا۔ میں جس عطیہ سے محبت کرنے سے قاصر تھا وہ عطیہ میرے آدشی پر کھٹے میں فٹ رہ آتی تھی۔ یہی ہمارا الیہ تھا۔ کیونکہ جب کوئی خیالوں میں مر جاتا ہے تو پھر زندہ نہیں کیا جاسکتا۔

جب میری شادی کو چندن ہوئے تھے مجھ پر شادی ایم ترکی طرح سوار تھی۔ میں سوتے میں جانگتے میں ہر طرفہ ہر جگہ اپنی بیوی میں لپشارتا عطا بیرون افاضے میں محبوب کا خط۔ کہ شادی کی اولین مر شادی کا ذکر ہے عطیہ کے سرہیں ایک شاہک دراٹھا۔ یہ دو اتنا تشویشا نہ تھا کہ میں نہ اپنے بھر جانگنا رہتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں سوچی آنکھوں والی جانگتے چہرے والی عطیہ میں کیا بات تھی کہ میں سکھنے پر سر رکھتا اور تڑپ کر رکھنے یہ ملتا۔ مجھے یوں ہی شک سانجا کہ میری آنکھ کلگئے ہی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چلے گی۔

ابدی لیکے آخری لان تھے۔

کروں میں سنکھوں کی غزدگی بھری آواز ہوا کے ساتھ آوارہ بھرنے ہی تھی۔ ہمارے گمرے کی کھڑکی سے جاں لا گھنادرخت نظر آتا تھا۔ رہ رہ کر اس کا کوئی سوکھا پتہ پکے فرش پر گرتا تو میں کاف پاٹھتا۔ صبح اذان ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کوئی گوکنے لگی تو عطیہ کی آنکھ کھل گئی مجھے کھڑکی میں کھڑا دیکھ کر وہ میرے پاس آئی۔ میں اور زندہ ہی ہوئی آواز میں بولی۔ آپ۔ آپ اسی قدر محبت نہ کیا کریں مجھ سے۔

میرے گلے میں بے شمار آنسا آچھے اور میں خاموشی سے اس کا چندن سما تھا سملاتا رہا۔ عطیہ نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور گھٹائی سی آواز میں بولی۔ ”مجھا سی محبت سے بلاخوف آتا ہے۔ اسی مختروں... میٹاکی مجتیں.... یہ.... پامدار نہیں ہوتیں... جی؟“

وہ ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ مذہب کا کیا اعتبار؟

کسی بھی بڑھتی اٹھتی دلواری لہ آتی اور کبھی یوں لوٹ جاتی ہے جیسے سائل کے کبھی آشنا تھی ہی نہیں۔ لیکن تب تو مجت مجھ پر ایمپر کی طرح چھانی تھی۔ میں نے اسی مدہوشی تکہا — "میں بھوکھ پنڈ کرتا ہوں بھوکھ سوچ کر پنڈ کرتا ہوں — مجت ناپانڈا نہیں ہو سکتی۔"

اس کی سوتی اسنکھوں میں موٹے موٹے چکدا رہنے والے اور وہ آہستہ سے بولی: "اسان تو بُشتنا گھٹتا رہتا ہے۔ یہ کوئی پتھر تھوڑی ہے کہ ہمیشہ ایک ہی جذبے سے بندھا رہے۔"

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ عین کی ہاتھا میں جامن کے درخت سے کئی پتے اکٹھے گئے۔

"میں موچتی ہوں۔ موچتی رہتی ہوں کہ اگر — اگر — آپ کی رنگی میں کوئی بہتر رنگی آگئی تو میں کیا کروں گی۔ کیسے RETREAT کروں گی؟ — فتح کے بعد تیچھے لوٹا جیسے تو کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

میں نے اس کا پھرہ ماتھوں میں لے کر کہا: "جس بہتر رنگی کی مجھے تماش تھی وہ مل گئی ہے مجھے:

علیحدے میرے منہ پر ہاتھ رکھو دیا تھا اور اسہت آہستہ کہتی گئی — "ایسی باقتوں کی نئے یہ عمر بہت بلی ہے۔ شادی کے دواہ تین دن بعد — سات سال تین ہفتے کے بعد تائیں سال اور زو گھنٹے کے بعد — کسی دن اچانک وہ منوس مل جائے اسکتا ہے جب مجھے تو آپ سے مجت سہے اور آپ کو..... انسان بد نتا رہتا ہے نہ — بُرخالہے گھٹتا ہے جا پڑیز تو ہے نہیں کہ ایک سی مجت کے چلانے — کئے جائے۔"

میں نے بات کو سنی میں ملنے کی خاطر کہا تھا۔ "میرا قدم از کم اور نہیں بڑھے گا۔ جلوہ میں میر سقد پر اعتماد کرنا چاہئے۔ پکا۔"

لیکن دہ تو فراح سے کوہری دو رنگی۔ اپنے آپ سے کہتی گئی۔ جب وہ آئے گی تو میدان کو خالی پڑے گی — میں خذلنے کا سائب بن کر آپ پر پہنہ نہیں دوں گی — میں تو — مجھے تو

میں تو.... مجھے اگر یقین ہو گیا کہ آپ کی خوشی اس سے دا بستہ ہے تو میں آپ سے یوں ٹالیدہ  
ہو جاؤں گی جیسے پنکا ہوا پبل ڈالی سے گرتا ہے — خود بخدا — اپنے بوجھ سے ”  
باہر سے تھنڈی ہوا کامیک بھون کا ٹھہر کی کی جانب آیا۔ کوئی زور سے کوئی اور جامن کے  
درخت سے ایک پتہ آنسو بن گرا۔

”تم — تم ایسی باتیں نہ کیا کرو علیہ — مجھے دکھ ہوتا ہے“  
لیکن وہ گھٹاٹوپ جذبایت کا شکار ہو چکی تھی۔ مجھ سے کم اور اپنے آپ سے زیادہ مخا  
نخی کہتی گئی۔

”مجھے تو ابھی سے اپنے آپ پر ترس آنے لگا ہے نتو — مجھے — میں تماری خوشیوں  
کے سامنے کبھی فضیل بن کر کھڑی نہیں رہ سکتا اور — تماری اس خوشی سے — چاہے میرا  
— نقصان بھی ہوتا ہو لیکن — میں وہ پھاٹک ہوں نموجو تماری خوشیوں کے لئے گھلتا ہے  
ہمیشہ — ہر لمحے —“

جلگتے چہرے اور سرفی انہکوں والی اپنے مستقبل کے بھیانک تصور سے لرز رہی تھی۔  
میں نے اس کا سر لپنے ماتھوں میں لیا اور آہستہ سے بولا : ”تو تو مجھے — اپنی پچھی لگتی ہے  
علیہ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی اچھا سابر تلاش کر کے تجھے اس سے بیاہ دون — لیکن  
اگر میں نے تجھے بیاہ دیا تو — بول اپنی پچھی کو کوئی فریب دیتا ہے — علیہ بول، بتا؟“  
کیا بعیب سکی بات ہے کہ یہ واقعہ تو مجھے اچھی طرح سے یاد رہے لیکن اس ولقوع کی وہ آہنی  
نور ٹوٹ چکی ہے جس نے اس وقت مجھے چھید ڈالا تھا۔ ذمباں سے ملنے کے بعد مجھے کثی بار اس رات کی یاد  
آئی جب جامن کے پیڑی سپتے آنسو بن گرتے تھے لیکن اس رات کا بوہ ججل پن جذبات سے  
بھیگی باتیں اور ایک وسرے کے لئے درجنے کی خواہش باسی پھول کی طرح مر جا چکی تھی۔

ہر مرد با آخرا یک ماشق مزاج عورت سے ڈرنے لگتا ہے۔ ایسی عورت کی وفا اس  
کی شنگی بے حد پر کوڑے کی طرح لگتی ہے۔ کاش عورت قربانی کو اس حد تک اپنا شعار نہ بنا لیا اک

کاش وہ سمجھ کے کہ مرد اپنی تما متر بے دفاؤں کے باوجود کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جس سے پہلے بُت ٹوٹ جائیں۔ اس نے دل کے کونے میں جس بُت کو پہلے پہل بھٹایا ہوا ہے اس کی فنی کرنے کے باوجود وہ بُت وہیں کمیں چھپا رہتا ہے — کیونکہ مرد ایک سمندر کی مانند ہے۔ اسے اپنے پرانے پانیوں سے بڑا یار ہوتا ہے۔

ہمیں ایک دوسرے کے جذبات کا کس تدریج پاس تھا۔

ہم تینوں ایکدوسرے کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ محبت خیال کے علاوہ اور کیا ہے؟ ہم تینوں ایکدوسرے کی اتنی عزت کرتے تھے کہ اسی احساس نے ہمارے منہ پر تالے ڈال دیئے۔ عظیم نے میری خوشی کے حق میں سب پھاٹک کھول دیئے۔ زماں پھاٹک کے اندر واخن نہ ہو سکی اور میں ایک زخمی کرتے کی طرح پھاٹک لی دلہیز پر بیٹھا اپنی ہی خوشی کے زخم چاٹا رہا۔

میں نے عظیم کو کبھی کچھ نہیں بتایا کیونکہ میرے پاس سوال ہے اس کیفیت کے جو میرے دل کے اندر تھی اُبتنے کو کچھ نہ تھا۔ عظیم کے پاس پوچھنے کے لئے کچھ نہ تھا کیونکہ اس کے پاس سہال نہ دسوں کوئے سوائے اندر ہونے والی صورت چنگ کے کوئی ثبوت میری بے دفاتی کا موجود نہ تھا۔ زماں میرے اس قدر قریب نہ آئی تھی کہ دلوں سے کچھ کہہ سکتی — اور اس قدر درود نہ تھی کہ اندر ہی اندر اٹھنے والے طوفان کو مکمل طور پر دبا سکتی۔

یہ ایک مرد چنگ تھی۔

ہر ایک فرد اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اپنی خود غرضی نے لڑ رہا تھا۔ اس چنگ میں اس کے تما اس فید جو تو سے ختم ہو چکے تھے۔ بیاری حملہ کر چکی تھی اور قوتِ مدافعت کے سارے خزانے ختم ہو چکے تھے۔

جس روز پہلی بار زمبا میرے گھر پہنچی تو میں باہر میں سوچ بند کر کے نیا فیوز رگا رہا تھا۔ اس نے کہی بار عظیم سے ملنے کی خواہش ظاہری تھی لیکن کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر رہی

سمجھاتی تھی کہ اگ اور پانی کو بکھارنے سے ایک نہ ایک کے ختم ہو جانے کا امکان ہے۔ زماں کو برآمدے کی سیر ہیں چڑھتے دیکھ کر میرا دل دھنک سے رہ گیا۔ میری رنگوں میں عجیب قسم کی کمزوری در آئی اور سہلا سامسوس ہونے لگا۔

وہ بہت دلپی پتلی رٹکی تھی۔ کامنگوں کے طاس میں بنے والے جب شیوں کی طرح اس کی چال ڈھال میں ایک طرح کی پھرپتی، ایک قسم کی رُتھی۔ اس کے حسن میں صحت کو بدھن خنا رنگت، لا عفنا، اوّاز سب صحبت کا اشتہار تھے۔

ستول سے اتر کر زماں کے پہنچا میرے لئے ایک مرحلہ بن گیا۔

"آپ کی مسروگھر پر ہیں ڈاکٹر صاحب ہے۔"

"جی ہاں ہیں تو سہی۔ پہنچے۔"

اس وقت منا باہر آگیا۔ گیلے بکٹ کو ہاتھوں میں بیان بنا آہوا۔ وہ زماں کے پاس۔

جا کھڑا ہوا۔

زماں بڑی خوش لباس رٹکی تھی۔ رنگوں کے امتزاج اور پہنچے کے چناؤ میں اسکی جھیٹی جس کاہ کرتی تھی۔ منا اس وقت بکٹ کی لپٹ سے چچپا سانظر آ رہا تھا لیکن پھر بھی اس دیدہ زیب نے بیک کر لئے گرد میں اٹھا لیا۔

"آپ کے پہنچے کے سامنے ان پتوں کی کیا جیشیت ہے ڈاکٹر صاحب....."

"تنے پیارے پتے کے سامنے ان پتوں کی کیا جیشیت ہے ڈاکٹر صاحب....."

میں منے کو اس کی گرد میں دیکھ کر ڈر سا گیا۔ کتنی مشاہد تھی درنوں میں۔

ناک کے بانے سے دور دور چکتی بھولی جالی آنکھیں، دھلی سی جلد اور بھیگے بھیگے گلابی ہوٹ۔

..... دونوں کو قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

افریقہ سے آئی بوئی یہ رٹکی کتنی بھولی تھی۔ بچوں کی طرح اسے علم نہ تھا کہ اسکی سنگوں

میں اس کھلانے کی خواہش نکلی ہوئی ہے جو اسے کوئی خوبی کرنیں دے سکتا۔

عطیہ اس وقت غسلنا نے میں تھی۔ میں زماں کو ڈالنگ ردم میں لے گیا۔  
وہ کارنس کے پاس چمٹے کے گول مونڈ سے پر بیٹھ گئی اور منے کے ہاتھ پانے ردم  
سے صاف کرنے لگی۔

"آپ کلینک پر نہیں گئے آئے....."

"لبیں اب تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔"

اندر عطیہ اپنی بے سُری اواز میں گاہر ہی تھی۔ ایک ایسے مشکل فلمی گانے کا ریاضن کر  
رہی تھی جس میں غاباً الکوئس درباری اور پت دینپ وغیرہ کی آمیرش نظر تھی۔ ہم دو نوں خاموش  
ہو گئے۔

منا اس کے کان میں پڑے ہوئے خانہ بدشہن جیسے بارے کوائیک سے جھلانے رکا۔

"آپ وہاں بنی پیا کرتی ہیں باقاعدگی کے ساتھ۔"

"جی —"

بھر خاموشی — بھی سی بے سُری "مان اور نہیں سی انگلی سے جھوتا ہوا۔  
زولہ قبیلہ کے مقلع نوآپ کے پاس فٹ ہینڈ انفریشن ہو گی — ان کے پاس  
تو ہوتے ہیں۔ آپ کا کوئی پرش تجربہ ہے ان ڈاکٹروں  
کے مقلع؟....."

لبی لبی پکیں اور پکر کاٹیں، جھلیکیں کھلیں اور انہیں پر دے رہن ہو گئے۔  
اُب تو جویں ان لوگوں نے بہت ترقی کرنی ہے۔ دراصل جی کا انگریزیں بنتو قبیلہ رہتا ہے  
اس قبیلے کی بہت سی شاخصیں ہیں۔ سوچیل، ازولو وغیرہ۔ اب تو چکاری نے — ایک  
تو میں لیڈر ہے جی زدلو ٹرائیب کا — چکواری نے بہت محنت کی ہے جی زدلو زپر  
متعدد بھی ہو گئے اور ترقی پسند بھی۔ اب تو دوچ ڈاکٹروں کی دہشان نہیں رہی جی وہاں۔  
وہ بنتو قبیلے کی بات کر رہی تھی اور میں اس بنتو کو دیکھ رہا تھا جس کی کمر جیتی کی طرح خدا

پچیلی اور پتی تھی۔ یہ کرڈھا کے کی مل تھی۔ ایک ریشمی روپاں میں ایک مرے سے درسے  
سرے تک اس کی پیمائش کی جاسکتی تھی۔ ہاتھوں کی انگوٹھی میں سے بخوبی لٹک لائتی تھی۔  
میں نے اس کی کمر کو چھو کر نہیں دیکھا حالانکہ وہ میری انگلیوں کی پوروں میں محسوس ہے  
رہی تھی۔ اس گرے میڑ نے جوانہ محسوس کی انگلیوں میں چھپا رہتا ہے اور جس کی مدد سے وہ  
ڈھوں کر کپڑے کا رنگ بتادیتے ہیں۔ اسی گرے میڑ نے مجھے زمبا کے جسم کی ساری اطاعت  
بغیر چھوئے سمجھا دی تھی۔

پہلی ملاقات ہی میں غالباً زمبانے عطیہ کی شخصیت کے سامنے گھٹنے میک دیتے تھے  
وہ اس احترام کی دیوار کو پھر کبھی بسایا نہیں کر سکی۔ اس کے پاس کھڑی کا کوئی گھوڑا موجود نہ  
تھا جس میں لپٹے جانا باز چھپا کر قلعے کے اندر لے جاتی اور یون ٹرائے کی جنگ کا پانس  
برل دیتی۔

عطیہ کو میں نے کچھ نہیں بتایا۔

اس کے باوجود ہیچے ہی دن اس نے غالباً شکست قبول کر لی۔ اگر وہ مجھ سے کم بھجوڑا تھا  
تو ابھی میں اس کے مستعلق کسی اور زاویے سے سوچتا۔ اس نے تو محمد پر کوئی الزام، کوئی تهمت  
نہیں لکھا تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس قدر جانتی تھی۔ لیکن اس دن کے بعد وہ ایسی  
منڈ منڈ لکلی بن گئی جس کی پتیاں نوچ کر علیحدہ کر دی جا بیس۔ اس کا چہرہ ننگا بچا اور بے رُنق  
ہو گیا جیسے کسی میجر کا پریش کے بعد میریعنی کا چہرہ ہو جاتا ہے۔

دراصل عطیہ میں پورش میں سپرٹ کی کمی تھی جو دقتی طور پر انسان کو بسادر بنادیتی ہے۔ اسیں زخموں  
ہے۔ عطیہ میں الکواں سپرٹ کی کمی تھی جو دقتی طور پر انسان کو بسادر بنادیتی ہے۔ اسیں زخموں  
پر لگانے والی سپرٹ تک کمی تھی۔ وہ ایک ایسی روح تھی جس میں کسی قسم کی سپرٹ میجر وہی  
نہیں تھی اسی لئے اس نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اٹا سومنا تھوڑا کے  
پٹ کھول دیتے اور سارا مال و متاع ان کے سپرد کر دیا جو درسے آئے تھے اور حق بکانب تھے۔

عُنیبِ دن تھے وہ بھی .....!

جب عصیہ اور میں اکیلے ہوتے تو عطیہ زمبا کی باتیں پھیڑ دیتی۔ اس کے لجے میں اور میرے لجے میں ہمیشہ فرق ہوتا۔ وہ بظاہر جوش اور محبت سے باقی نہیں کرتی، میں بظاہر سرد مر رہتا۔ لاعلاقی سے باقی نہیں سنتا۔ بے ربط جواب دیتا۔ لیکن اندر سے میرا وجد مُسر کی ہوئی ستار کی طرح تناہ تہلہ زمبا کے ساتھ بھی ہمیشہ عطیہ کی باقی نہیں ہوتیں۔ زمبا دل کھول کر عطیہ کی تعریف کرتی۔ اتنی تعریف کر میں لو کھلا جاتا۔ میں بظاہر گرچھوئی کے ساتھ عطیہ کی باقی نہیں کرتا لیکن میرے اندر برف کی قاشیں جنتی چل جاتیں۔ کوئی پھر مجھے من کرتی جاتی۔

یہ میرا ہی حال نہیں ہے۔ غالباً ہمارا شوہر کا ہوا ہو گا جس نے شادی کے بعد ایسی ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ عطیہ مجھ سے اس محبت کی وجہ سے سرد مری برے۔ میں اس سے نہ بد لئے کی تو قع رکھتا تھا۔ حالانکہ خود میں اور میرے جذبات اس کے لئے بدل چکے تھے۔ اس معاملے میں میری خود غرضی مثالی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ عطیہ کی محبت مجھ سے کم نہ ہو۔ وہ ہر وقت اسی پسروں کے ساتھ مجھے ملے جس طرح ملتی آئی تھی۔ جسم اور روح کی کل پسروں کے ساتھ۔ یہ زیادتی تھی۔ میں زمبا سے محبت بھی کر رہا تھا اور اس کی قدمت بھی ادا نہ کرنا چاہتا تھا جو غالباً عطیہ کی سرد مری سے ادا ہو سکتی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں ہر لمحے میں نے ماغفت کی۔ ہر قسم کی حنفیتی تذابیر کیں۔ ایسے منصوبے، وعدے، اصول بنائے جو مجھے زمبا سے نبات دلا سکیں۔ لیکن میں تو زخمی ہو چکا تھا۔ نا زکر ہرنئی طرح میں بھاگ بناگ کر غنک چکاتا اور میرے تعاقب میں وہ سنگ گھوٹے تھے جس کے سموں سے شدید آثار تھے میں۔ یہ دوڑ، یہ فرار، یہ جدوجہد جو ما رائیگاں ہوتی کیونکہ حساس نہ تھوں والی ہرنی کی قوت بالآخر جواب دے جاتی ہے اور بہت جلد بجلی کی طرح چکتے جسموں والے اور شبکی مُسرینوں والے گھوڑے اسی سماں آپنے پہنچتے ہیں اور وہ بے سدھ تھیلیاں زیں میں کاڑے آنکھیں بند کئے اپنے آپ کو آنے والے انجام کے حوالے کر دیتی ہے۔

یہی حال میرا ہوا۔

میں بہت بھاگا اور بالآخر میلوں کی مسافت کے بعد میں نے سنکھن  
بند کر لیں اور بے حال ہو کر گر پڑا۔

اس روز جب میں زمبا کو فاظہ جناح کے گیٹ پر چھوڑ کر لوٹا اور میں نے گیراج میں گھر کا  
بند کی تو دیر تک میں نے اس سیٹ پر نا تھڈائے رکھا جس پر زمبا بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم درنوں  
بغیر کچھ کئے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تھے جیسے شکست خورہ ٹیم کے کھلاڑی میدا  
سے فکلتے ہوئے ایک دوسرے سے آئندہ نہیں ملتے۔

نہ میں نے اس سے اقرار پر محبت کیا زداں اس نے تھے اقرار پر تماہ کیا۔ حالانکہ رات کی  
ٹھنڈک میں یعنی اشتر سے تھے اور فضا خود بیوں جگنوں کی طرح جلتی بھتی تھی۔ میری کار میں زمب ای  
خوبصورتی۔ ہمیں سی فراں سی خوبشو میں ملی جلی جلتے رہنکی خوبشو.....

میں دیر تک دہلی پربازور کھے بیٹھا رہا۔ بالآخر جب اس کی غیر موجودگی کا تلقین ہاں تو  
جن کریم سے گئے میں اترنے لگا تو میں اٹھا کر بند کی اور اندر چلا گیا۔

میں عظیم کو کیسے سمجھتا کہ محبت کوئی ٹرین تو بے نہیں کو پچھلے ڈبے کاٹ کرنے سے ڈبے  
لکھئے جائیں۔ یہاں تو پچھلے ڈبے اور نئے کوپے یوں الپس میں ملے جلے میں پھیلی محبت نئی  
محبت میں کچھ یوں بغایلک پہ بیسے ایک ہی کتاب کے مختلف ورق!

عظیم سے کا گال اپنی ہنسی کی ہڈی پر رکھے سورہی تھی۔

بیٹھ لیپ کی روشنی کا ہال منے کے سر پر تھا۔

مان اور بیٹھ کا رشتہ — کم از کم اس داشتے کی راہ میں وہ منزہ لیں نہ تھیں جن پر پل کر  
آدمی مزور بچھڑ جاتا ہے — اپنے چلپتے والوں سے۔

میں چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔ اسی نظر سے ماما بدھنے آخری بار اپنی رانی اونچے  
کو دیکھا ہوگا کہ رب کی کمی مزدہوں سے گزر کر وہ بھی ایک شمع پر پہنچا ہو گا کہ بچھڑنا، بگزیر ہے!

ماہما بده اس فیصلے پر پسخ کر مجھ سے نگے نکل گیا۔ اس نے بھروسہ کر بیشودھ را اور پچ کی طرف نہ دیکھا ہو گا۔ ورنہ وہ بھی میری طرح کو مگر کے عالم میں رہتا اور کچھ نہ کر پاتا۔ میری نئی محبت کا پچھہ جنم لے کر ڈیوری روم میں آچکا تھا اور پچھلی محبت کا آنول بھی نہک اس کی ناف سے نک رہا تھا۔ اس نئے پچ کی اپنی ایک زندگی تھی اور نئی کسی آنول کا اپنا ایک رشتہ تھا۔ میں سرجن ہونے کے باوجود قلبی اشکار اس آنول کو کاش نہ سکا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔

خدا جانے میں کتنی صدیاں اسی طرح کھڑا رہا۔ بھلی کی ننگی تار کی طرح کرنٹ سے بھرا۔ کئی پچھا روزات کے زمانے آئے تابے اور سونے کے ظروف بنائے۔ انسان ناگ یا کر جنگل سے، جانوروں کو بھون ڈالا اور الاؤ کے گرد بیٹھ کر نوجوانوں نے عشقیہ گیت سنائے۔ اب ان حدیوں کا، اس وقت کا، اس استغفار کا کچھ باقی نہ رہا۔ الاؤ کے گرد بیٹھنے والے اور مژانی و شہ طیارے میں لامڑے سے گریٹ جلانے والے کے درمیان ایک آگ نا رشتہ باقی رہ گیا۔ اندر کی ادھ جلی آگ — باہر کی بینے اور شفاف آگ — نئے ڈیوں اخن کی آگ — دیلہ بک مشین کے شعلوں سے نکلتی آگ — نفرت کی آگ — محبت کی جبکہ بونا آگ — اپنے آپ کو بچلنے کی آگ — دوسرا کو آگ سے نکلنے اور بھرا ہی آگ میں دھیمل دینے کی آگ —

کھال پہنچنے والا، پتھر کے نیزدیں سے شکار کرنے والا، بھلی غاروں پر کھالیں نکلنے والا رخصت ہو پکا تھا۔ اس کا ہم سے کوئی رشتہ باقی نہ تھا۔ اس کی زبان اور ہمارے رسم الخط میں نرف ایک لفظ سا بجا تھا  
آگ کا شعلہ رو لفظ۔

اس بھٹی میں آج کا ماڑن آدمی بھی جل رہا تھا۔ شدار مکن کا سوت پس کر کنکریٹ پر پہنچنے والی کی آگ نہیں بدلتی تھی۔

پھر پتہ تھیں کب عظیم کی آنکھ کھل گئی۔

اس جانگتے چرسے نے کچھ نہ پوچا۔ ان سوئی آنکھوں نے کوئی سوال نہ کیا۔ دراصل ہمارے درمیان باقاعدہ مبنی موکھ گیا تھا جو نقطہ رکھنے والے جانور کے لئے آبِ حیات ہے۔  
کھانا لگاتے ہوئے اس نے کوئی ہزاروں بار کہا: ”کیسی پیاری لڑکی ہے زمبا؟“  
میں خاموشی سے نواز توڑنے لگا۔ میں اس جھوٹ تک دیکھ سکتا تھا۔  
”کتنی خوبصورت ہے۔ چینی کی ٹکلیوں کا سالمان رنگ.....“

ٹیکہ لگونے سے پہلے جس طرح مریض کیدم TENSE ہو جاتا ہے میں بھی اسی طرح بوڑوں کے اندر پاؤں سکر ڈے میٹھا تھا۔ مجھے اپنی اواز پر اعتماد نہ تھا ورنہ میں اس کی بات کا جواب ضرور دیتا۔  
”آج آئی تھی زمبا۔ بڑی دری نہ منے سے کھلیتی رہی۔“

میں اسے بتانے سکا کہ زمبا مجھے پہلے ہی سب کچھ بتا پا چکی ہے۔

پرانی محبت کی زنبیری ٹوٹنے اور نئی محبت کی قید کے درمیان ایک دفت ایسا بھی ہوتا ہے جس میں کوئی چیز و ثقہ سے کہی نہیں جا سکتی۔ دودھ کو جامن لگانے اور دہی کے بن جانے کے درمیان ایک عوقت ایسا بھی ہوتا ہے جب دودھ دو رہ نہیں رہتا اور دہی بھی کم نہیں سکتا توڑا سو بار دل میں یہ امید بند ہو جاتی ہے کہ نئی محبت خدا اپنی مت مرجانے میں یا پھر ایک صبح اچانک ساتھ دل کے ملکے پر بھلی مجبورہ کی آنکھیں اجل نے بند کر دی ہوں گی یا اپنا سانس رک جائے گا..... یہ درستے اطمینانی کا دوزن ہوتا ہے۔ پچھلی محبت سے بند ہے سینے کی خواہش اور اسی محبت سے چھوٹ جانے کی موہوم سی امید.....

ایسے جیسے فار پر چڑھ کر آدمی غناٹ آئے حیات کا پیالہ پی رہا ہو۔

اس دوسری انسان گندھی ہوئی مٹی کی طرح کھمار کا منتظر ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ چاپ پر چڑھ کر ٹھیلیا، آب بخورہ، گلا، گونڈا، صراحتی، نامذہ، ہندڑیا، کنالی یا خدا جانے کو نہ سا برتن بن جائے گا۔ یہ وقت سالس روکے رہنے سے کھٹا ہے۔ وہ موسم سے یوں متاثر ہوتا ہے جیسے چینے کی فصل ہو۔

چھوٹی چھوٹی بے معنی باتوں پر اس کے کان، شکاری کئے کی طرح کھٹے ہو جلتے ہیں۔ اس کی حیثیت  
تیر کافی دار چاقو کی طرح سمجھی ہوتی ہیں۔ وہ لمبوں میں ہمتوں کی، ہمینوں کی، اسالوں کی زندگی بصر کرتا  
ہے۔ یہ دو احساسی گناہ اور لذتِ گناہ کی شراب سے دو آتش بن جاتا ہے۔  
میں سارا سارا دن سوچتا ہو تاکہ علیہ کس قدر جانتی ہے؟  
وہ مجھ پر کس حد تک شبہ کرتی ہے؟

میں نے تو ابھی تک زمبا سے اقرارِ محبت بھی نہ کیا تھا تو میں علیہ کو کیا بتاتا۔  
اسی الجھل میں اسی شرافت میں دمبا میڈیکل کالج کے تھرڈ ایئر میں پہنچ گئی۔

ہم تینوں خودداری کے پتے تھے۔

ہم تینوں میں سے ایک بھی بے رحم نہ تھا۔

ہم تینوں کو اپنی ذات سے کم اور درسرے کی خوشی سے زیادہ سروکار تھا۔

اسی طرح پورے تین سال گزار گئے اور کچھ فیصلہ نہ ہوا کہ یہم تینوں فیصلہ کرنے کیے  
نہیں بنتے تھے۔ میرے صبر کی ساری توانائی کو یہ گولگو کا عالم کھا گیا۔ علیہ کے چہرے پر چھائیاں پڑیں  
گیتیں۔ آنکھوں کے تیچے سیاہ حلے اور آنکھوں میں منتقل نمی رہنے لگی۔ دمبا چپکے لیے قلندر  
سے آشنا ہو گئی جو مرستے گھرے ہوتے ہیں۔

مجھے وہ دن ابھی بھی یاد ہے جب میں نے زمبا کو علیہ کے گھر، ہونے والے پکے کی جیسا نئی  
تھی۔ ہم تینوں بازار گئے ہوئے تھے۔ علیہ میرے ساتھ دو الی سیٹ پر تھیں اور زمبا منے کے ساتھ پچھلے  
سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر اچانک بازار میں علیہ اپنی ایک سیلی سے بائیں کرنے لگی۔ مذاہر کرمان کے ساتھ جا کر  
کھڑا ہو گیا۔ اور ہم دونوں بیٹھے رہ گئے۔ میں نے بر تزویں کی دکان پر نظریں جا کر کہا۔ — ”علیہ کو  
اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے..... قم اسے سمجھا ہو۔ مہاری تو ہربات مان لیتی ہے علیہ۔“  
”جی ہاں — آپا تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہیں.....“

میں زباؤ کو بتانا نہیں چاہتا فنا کر میری بیوی حاملہ تھی ۔ خدا جنے دو کیا جذبہ بہ تھا جو  
محبیہ بخوبی تھے، ہوئے اُزم سبانار نہ تھا۔

”عطیہ حاملہ ہے ۔ ۔ ۔ اسے اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔“

میں نے شدھدا اندری لجئے میں بہ زبان انگریزی کہا۔

خدا جنے کیا بات تھی کہ زباؤ اُنھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے ۔ ۔ ۔

دل ہی دل میں سمجھنی تھی کہ اس کے آنے کے بعد میں نے ٹرین کا آڑی ڈبہ آتا پھیکلائے ۔

میں اسے کیسے سمجھتا تھا کہ میاں بیوی بغیر عشق کئے بغیر جذبے کے ایک درست رہا  
کرتے ہیں۔ پچھے آتے چلے جاتے ہیں۔ صرف ان پھول کے انتھوں پر وہ نور نہیں ہوتا جو عشق  
عنایت کرتا ہے۔ خیال سے پیدا ہونے والا حسن نہیں ہوتا۔

وہ خاموشی سے رومال میں آنسو چھپاتی رہی اور میں چور نظروں سے سامنے دلے شیشے میں

لے دیکھتا رہا۔

”میں نے اسے کچھ کہا۔“

”اس نے مجھے کسی صفائی پیش کرنے پر آمادہ کیا۔“

اوہ عطیہ فٹ پا تھر پر منٹے کا ایک ہانگھ تھا اسے اور درست سے کوپٹ میں چھپائے عجیب  
قسم کے درود زہ میں مبتلا رہی۔ زادس نے منہ کھول کر آہ بھری ز دانت پھینکے۔ بس خاموشی سے  
دور کی لمبیں لپٹنے اندر جذبہ کرتی رہی۔

اس شامِ شہرِ شہر کر ہوا چلتی تھی۔

آنگن میں جامن کپتے تو کہ ہوئے آنسو دل کی طرح اچانک گرتے تھے۔ میں کلینک پر جانے  
کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ عطیہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور سماہت سے بعلی ۔ ۔ ۔ آپ زباؤ کو

بلایجئے۔ منا اس سے بہت ہلا ہو لے۔“

میں نے اس کے لندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ۔ ۔ ۔ کیا بات ہے عطیہ ۔ ۔ ۔ میں

خالہ جان کوتار دے دوں ..... ”

” نہیں۔ امی آکر کیا کریں گی۔ آپ زماں کو بلا لائیے۔ اس کے ساتھ منا اداں نہیں ہو گکا۔“  
میں نے پنگ پر عطیہ کو شکر اس کے سیٹ کا معانڈ کیا۔ پنک کی گردش تیز تھی بلند پر شیر  
خطراں کا حصہ بڑھا ہوا تھا اور درد کی پہلی علامتیں شروع تھیں۔  
” کسی کو نہ بنایے۔ صرف زماں کو بلا لائیے ..... ”

جس وقت میں عطیہ کو لے کر سپتال کی طرف روانہ ہوا۔ زماں میں کو گود میں لئے برآمد  
میں کھڑی تھی۔ عطیہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر مٹانے کی چادر تھی اور وہ  
بار بار لب کا ٹھیکی تھی۔ اس لمحے مجھے ایک بھی نہ تینڈن کا حساس ہوا جیسے انسان اپنے ہی  
میٹھے کا گلا گھونٹ دے۔

عطیہ نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ میں کی طرف نگاہ کی نہ اپنے گھر کو دیکھا۔  
سوئی انکھوں میں ایک عجیب قسم کی گیفیت تھی۔ سو مناکھ کامندر گھونٹنے والے پچار ہوں  
کے بے چارگی .....  
اس رات ٹھہر کر ہو چلتی تھی۔

اور جامن کے پیڑے سوکھے پتے چڑ کر پکے آئکن پر گرتے تھے۔  
میں ڈیوری روم میں عطیہ کے ساتھ تو نہ جا سکا لیکن سپتال کے باہر کار کی سیٹ پر بیٹھے  
ہوئے میری نظروں میں وہ سب مرحلے تھے جن سے عطیہ گزر رہی تھی۔ رہ رہ کے ایک تصویر سی  
وڈ سکریں پر ابھری تھی۔

عطیہ درد سے کراہ رہی تھی۔

عطیہ کے بازوں میں گلوکوز لگا تھا۔

عطیہ آہنی پنگ کی پٹیاں پکڑے سانس روکے درد سے اپنا پچ ماہک رہی تھی۔ اس کے  
بال پسینے سے جیگ چکتے۔ نریں لے سمجھ کر اپنی ہی باتیں کئے جا رہی تھیں۔

علیہ ایک ایسے آدمی کا پور جن رہی تھی جس کا اس کے ساتھ کوئی جذبائی تعلق نہ تھا۔  
پھر سیٹھے میتھے وندسکرنیں دھل جاتی۔ علیہ کی شیئہ مٹ جاتی اور زمبلنے کو گود میں اٹھائے  
وندسکرنیں پر مرسم ہو جاتی۔

منا اور زماں — کتنی مشابہت تھی دونوں میں۔

زمبلنے نے کوکس قدر محبت سے اٹھار کھا تھا۔

وہ ایک ایسے بچے کو اپنی ساری محبت دے رہی تھی جو اس کی کوکھ سے پیدا نہ ہوا تھا۔  
جب رات کے پھرپھلے پھر میں ڈیلوری روم میں گیا تو علیہ گیس کے مینٹ میں اونچے اپنے  
سانس لے رہی تھی۔ اس کے ایک بازو میں بلڈر گاہ ہوا تھا اور زمیں اس نبچے کا آذول کاٹ رہی  
تھیں جو پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا۔

پھرپھلی محبت کا مردہ بچہ.....  
نیکلوں زنگت، سبھی ہر میں مٹھیوں اور ادھر کھلی آنکھوں سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے  
چہرے پر نہ زندہ رہنے کی خواہش تھی نہ ترس کی بھیک مانگنے کی خواہش۔  
وہ تو ایک بن ایں بانے کا پر تھا جو نظرت نے اپنے قانون کے سنت غلطی سے بھیج دیا تھا۔  
وہ اپنے وجود میں کھویا ہوا — گم مم اس لمحے کی طرح ساکت تھا جو گر تو جاتا ہے لیکن  
کبھی یاد نہیں آتا۔ جب میں علیہ کو پرا یوٹ روم میں چھوڑ کر گھر لوٹنا تو اذان کا وقت قریب تھا۔  
ہوا ٹھہر ٹھہر رہ چلتی تھی۔

دور کمیں کوٹل گھامی ہو کر کوئنکنگی تھی۔ جامن کے سوکھے پتے رک رک رک رہتے تھے۔

بڑی تیک پ روشن تھا۔

زمبا علیہ کے سیکھے پر سر کھے سورہی تھی۔ اس کی سنسکی کی ٹہنی پر منے کا گال تھا اور روشنی  
کا ایک نال۔ دونوں کے ناروں پر پڑ رہا تھا۔

مجھے حکوم نہیں علیہ کہاں ختم ہوئی اور زماں کہاں شروع ہو گئی؟

میں نہیں جانتا کہ پہلا ذریعہ کس طبقے کت گیا اور نئے کو پے انہن کے ساتھ کیسے جوڑ دیتے گئے؟ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس رات اذان سے کچھ دیر پہلے میں دشوق کے ساتھ اسی ایوان میں داخل ہوا۔

گندھی ہوئی مٹی چاک پر چڑھی اور ایک اور کاسہ تیار ہو گیا — محبت کی دلہیز پر پڑا ہوا خالی کامسر۔

.... پچھلی محبت کا بچہ میں نے دناریا کیونکہ لاشوں کو بہشت تو گھر پر نہیں رکھا جائے سکتا ہے محبت کے صحیح منہن پے کا آنول کامنا اور اس کے ردنے سے کمرے میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔

میں جانتا ہوں عطیہ کی موت حادثہ نہیں ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں یہ فطری موت نہ تھی۔

ہسپتال والے اسے حادثہ کہ سکتے ہیں۔

کیونکہ ان کے زدیک صحبت منہ ہو کر ریپن کا مر جانا حادثہ ہے۔

لیکن میں خوب جانتا ہوں ڈاٹرکی بیوی ہو کر وہ غلطی سے اتنی تعداد میں سو زل نہیں کہا سکتی تھی۔

ہسپتال والے چلے ہے اسے حادثہ کہیں لیکن میں خوب جانتا ہوں۔

حالانکہ مجھے سے عطیہ نے کچھ نہیں کہا۔

حالانکہ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔

حالانکہ عطیہ کے گھر کرنے کے بعد زیما افریقہ لوٹ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

حالانکہ میں اور میا — اور میرا گھر سب اسی کے منتظر تھے۔

وہ ایک رات سرشار کے نزد میں گئی اور مٹھی بھر خواب آور گویاں۔ لے آئی جب اسے گھر آنا چاہئے تھا وہ ایک اور سفر پر روانہ ہو گئی۔